اُردو کی طویل نظموں میں 'مشرق' کا بیانیہ

Narrative of 'East' in long Urdu poems

Dr. Abid Khurshid

Assistant Prof. Ghazi University, Dera Ghazi Khan

Dr. Muhammad Said Ali

Lecturer, Ghazi University, Dera Ghazi Khan

Shazma Zahra

Lecturer, Govt. Associate College for girls Choti Zareen, D.G Khan

ڈاکٹر عابد خورشید

اسسٹنٹ پروفیسر، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان

ڈاکٹر محمد سعید علی

لیکچرار، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان

شازمہ زہرا

لیکچرار، گورنمنٹ گرلز ایسوسی ایٹ کالج، چوٹی زیریں، ڈیرہ غازی خان

Abstract: Along with the partition of India, another theme echoes in modern Urdu poetry, and that theme is Orientalism. Urdu poetry was fortunate that the poets of Pakistan and India wrote timeless poems on this subject. The East sometimes covers the common India on a geographical level and sometimes it is connected with the split of Pakistan where it is defined as 'the East has lost' In the discourse of the East, the West is made to believe that the East is one and its common voice is stronger than the voice of the West. The cultural harmony of the East is so common that even its tragedies are the same, the biggest reason for which is the insensitivity of the West

Keyword: East, Partition, long poem, Orientalism, West, discourse, cultural , subcontinent

p ISSN: 2789-4169

e ISSN :2789-6331

Received: 13-5-2023

Accepted:

Online:

Copyright: © 2023 by the authors. article open-accessThis is an distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

طویل نظم کے موضوع کی گھمبیرتا، تجربے اور احساس کی اساس کے ساتھ فنی ہنرمندی پر بھی منحصر ہوتی ہے اور اگر شعری تجربہ بباطن گہرا ہو تو وجود پذیری کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ طویل نظم میں موضوع کی گرفت، اسلوب و آہنگی میں معنویت، اظہار کی کلیت کو سمیٹنا اور قابلِ قرات رکھنا ایک خاصا مشکل مرحلہ ہے۔ اگر موضوع کا گھمبیر ہونا اضافی ہو تو ممکن ہے طویل نظم موضوع اور کئی صورتوں میں احساس کی تکرار بن کر رہ جاتی ہے، چاہے وہ کیفیات کے زیر نگوں ہی کیوں نہ رونما ہو۔ طویل نظم کی ایک صفت بتدریج اپنے حصار کو پھیلانا بھی ہے۔ ذوق سماعت کے ظاہری کالبد میں فکری و اساسی طور پر ان گنت پرچھائیاں ہوتی ہیں جس سے تشبیہ و استعارہ، علامت یا دیگر معنوی پہلوؤں کا جواز تلاشنا شعری عمل کو نکھارتا ہے۔

جس طرح کسی شاعر کا انفرادی اسلوب اُسے منفرد شناخت کی میزان پر براجماں کرتا ہے۔ اگر زیرک نظری سے مطالعہ کیا جائے تو ایک عہد کا اجتماعی اسلوب بھی ہوتا ہے جس میں علامت، تشبیہ اور استعارہ کے علاوہ طرزِ احساس بھی کئی اشتراکات جمع ہو جاتے ہیں، جو تفہیم کے نقطہء نظر سے بین السطور زیادہ اہم ہے۔ یہ بربنائے کمال نہیں، بلکہ بیان مطلب اور اظہارِ مافی الضمیر سے عاجز رہنے کے سبب ہے۔

جدید اُردو نظم میں ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ساتھ ایک اور موضوع کی بازگشت سنائی دیتی ہے، اور وہ موضوع مشرقیت کا ہے۔ اُردو شاعری کی خوش قسمتی تھی کہ اِس موضوع میں پاکستان اور ہندوستان کے شعراء نے لازوال نظمیں لکھیں۔ مشرق کہیں تو جغرافیائی سطح پر مشترکہ ہندوستان کا احاطہ کرتا ہے اور کہیں اِس کی صورت پاکستان کے دولخت ہونے سے بھی جڑ جاتی ہے جہاں 'مشرق ہار گیا' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مشرق کی للکار میں مغرب کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ مشرق ایک ہے اور اُس کی مشترک آواز مغرب کی آواز سے کہیں توانا ہے۔ مشرق کا ثقافتی آہنگ مشترک ہے حتیٰ کہ اِس کے المیے بھی ایک جیسے ہیں جس کی بڑی وجہ مغرب کی بے حسی بھی ہے۔

اُردو میں طویل نظم میں جہاں 1947ء اور اُس کے پیش منظر اور پس منظر کو مستقل موضوع بنایا گیا اور لازوال طویل نظمیں لکھی گئیں، جن کے اثرات خاص طور پر اُردو شاعری پر طویل عرصہ تک مرتسم ہوتے رہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، تاہم اِس کے ساتھ ہی ایک اور مشترک موضوع 'مشرق' بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس حوالے سے تقسیم برصغیر کے فوراً بعد ہمارے ہاں احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، سلیم احمد اور ہندوستان سے اختر حسین جعفری نے اِس موضوع پر قابل قدر تخلیقات پیش کیں۔ تہذیبوں کے اختلاط سے مزین یہ خطہء ارضی قدیم باشندوں سے آریاؤں کے غارت گروں سے نبرد آزما اور پھر ازمنہء وسطیٰ کی روایات کو سمیٹے اساطیر کی طرح موجزن ہے۔ مشرق کے قدیم و جدید تناظرات میں یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ 'مشرق' کہیں تو اِن طویل نظموں میں جغرافیائی خطے کے استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے اور بیشتر اِسے مشترکہ ہندوستان کے لیے برتا گیا ہے۔ اِس میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ شعراء نے 'مشرق' اور 'ایشیا' کو یکجان دو قالب بھی قرار دیا ہے اور اِنھی دو الفاظ کو مذکورہ خطے کی وسعت پر بھی پھیلا دیا ہے۔ ان طویل نظموں کے تلازمہ اور رموز و علائم کے دائرہ کار میں مقامی سے بین الاقوامی سطح تک

ظہور پذیر ہونے والی سیاسی انتشار اور انسانی حقوق کی پاسداری میں جنم لینے ہونے والی عوامی تحریکات سب کچھ آ جاتے ہیں۔ آیئے اِن نظموں کے بطون میں جھانکنے کی سعی کرتے ہیں :

مشرق و مغرب / احمد ندیم قاسمی

سرد ملکوں کی دوپہر کا لباس
ایک ایسی مہین چادر ہے
جس کی پرتوں میں جسم کا سونا
قہقہے بن کے مسکراتا ہے
اور اپنا لباسِ عریانی
جس پہ سورج، شعاعوں کے کوڑے
اِس قدر طیش سے لگاتا ہے
راکھ کا ڈھیر چھوڑ جاتا ہے
(۱)

احمد ندیم قاسمی (20 نومبر 1916ء - 10 جولائی 2006ء) کی طویل نظم 'مشرق و مغرب' اُن کے شعری مجموعے "دشتِ وفا" میں شامل ہے اور زیر نظر متن اُن کی نظموں کی کلیات "ندیم کی نظمیں" سے لیا گیا ہے۔ اِس نظم کا دروبست طرزِ فکر کے علاوہ مشرق اور مغرب کے طرزِ احساس کو بھی منقلب کرتا ہے اور پھر اُس کے اثرات بھی اپنی عمل داری قائم کرتے ہیں، زیریں سطح پر یہ زاویہ بھی مخصوص اہمیت کا زائیدہ دکھائی دیتا ہے۔

علاوہ بریں اُن کی طویل نظم 'نیا ایشیا' بھی اپنے مخصوص پس منظر کی وجہ سے معروف نظموں میں شمار ہوتی ہے، جس میں اُس واقعہ کی بازگشت ہے، جو ے فروری 1931ء میں چین میں پیش آیا اور جس کی پاداش میں چھ ادیبوں کو موت کی سزا سنائی گئی۔ "نیا ایشیا" اِسی حوالے سے لکھی گئی۔ یہ طویل نظمیں، ارتقائی سفر میں الگ الگ مطالعہ کی متقاضی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی طویل نظم "مشرق و مغرب" اُن کے جمہور پسند نظریات کے حامل ہے، جو کہ اُن کی شاعری کا محبوب موضوع بھی ہے۔ وہ نظم میں سرد ملکوں کی دوپہر کے لباس کو ایسی مہین چادر سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں سے جسم کے سونا مشرق کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے، پھر مشرق کی حالت پر قہقہے لگاتا ہے، نظم کا اسلوب ترقی پسندانہ رُجحانات کی عکاسی تو کرتا ہے لیکن اِس سے کہیں اہم وہ رویہ ہے جس میں مشرق کی قدامت پسندی کارفرما ہے۔ اِس نظم میں مشرق اور مغرب کی طرزِ معاشرت پر گہرے سوالات اُٹھائے گئے ہیں، جو اپنی معنویت کو اِن دونوں براعظوں کے مزاج کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور انسان کی آفاقی حیثیت کو اُبھارنے کی سعی کرتے ہیں، ڈاکٹر سعدیہ طاہر لکھتی ہیں:

'مشرق و مغرب' میں احمد ندیم قاسمی رنگ اور رُت کے باعث انسانوں میں بود و باش اور رنگ و نسل کے تنوعات کو بھی انسانی وحدت اور فنی آفاقیت تک پہنچنے میں رکاوٹ نہیں سمجھتے اور پوری دُنیا میں بسنے والے انسانوں میں انسانیت کے مشترک ورثے کو زندگی کی آفاقیت اور انسانیت کی وحدت کا ایک جیتا جاگتا مظہر قرار دیتے ہیں۔(۲)
نظم کے یہ مصرعے ملاحظہ کیجئے، جو نظم کے موضوع کو تہ داری سے تاریخ کے منطقی روابط، مفروضاتی اور نظریاتی آدرش سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں رایگانی کے احساس سے مملو دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نظریات تشکیل کردہ معنویت کے حامل ہو سکتے ہیں۔ اِسے ہم ادبی اصولیاتی نظریے سے متصادم بھی کہہ سکتے ہیں، تاہم اِس طویل نظم کے عرصہء تخلیق میں یہ غیر اہم نہیں :

گرم ملکوں کے عشق پیشہ جواں
دھوپ کی چلچلاتی نگری میں
ہل چلاتے ہیں، بیج بوتے ہیں
اور پھر عاقبت کو روتے ہیں
ان کی محنت پہ وجد کرتے ہوئے
موتیوں سے لدے ہوئے خوشے
جتنے بھرپور ہوتے جاتے ہیں
اِتنے ہی دور ہو جاتے ہیں(3)

"گرم" اور "سرد" ایسے الفاظ میں جن میں معنوی ہیجان موجود ہے، اُن سے قاسمی صاحب نے بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے، اُن کا ایک شعری وصف یہ بھی رہا ہے کہ وہ محض الفاظ کے برتاؤ سے تمثیلی آہنگ پیدا کر لیتے ہیں، جس میں رومانوی رچاؤ بھی ہوتا ہے اور حقیقت پسندی کی رسائیت بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ ڈاکٹر عمران ازفر کی یہ رائے اُن کی اِس ہنرمندی کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتی ہے، وہ لکھتے ہیں :

[احمد ندیم قاسمی] نے دھمے، چیخ، آہیں، کھنک، چھنک کے برمحل استعمال سے جو چھوٹی چھوٹی تمثالیں پیدا کی ہیں وہ پُر اثر ہیں اور قاری کا ذہن انسانی کی ارزنی، بے معنویت اور افراتفری کی طرف چلا جاتا ہے، جہاں وہ تنہا اِس دُنیا میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اِس نظم میں استہفامیہ تمثالوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تخلیق کیا ہے۔(۴)

کسی بھی خطے کی تہذیبی و تمدنی روایات کا مطالعہ یہ رُخ بھی سامنے لاتا ہے کہ تاریخ محض آلہ کار تو نہیں، جس پر اندراج کیا جا سکتا ہے اور نتائج اخذ کرنے کے لیے اثر و نفوذ کی یافت کی جا سکتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی مذکورہ نظم اِس خطے کے انسانی رویوں اور اُن کے مزاج کے اظہار تک رسائی کی کارگزاری ہے۔ وہ مغرب کو اپنے تحریف کے طور پر اُسے اپنے درمیان بُعد قرار نہیں دیتے بلکہ اُسے احساس کی سطح پر بیدار کرنا چاہتے ہیں۔

ایشیا/ ظہیر کاشمیری

ایشیا...... کلفت شب کی پروانہ کر
تیرگی رفتہ رفتہ تیرے دشت و کہسار سے اُڑ چلی
تیرے بیٹے شبستاں کی آسودگی سے گریزاں ہوئے
وہ تلاش سحر میں مصائب کی صبر آزما گھاٹیوں سے گزرنے لگے
وہ ابھی حسن تدبیر کے پر لگا کر اُفق کی تہوں تک پہنچ جائیں گے
وہ ابھی تجھ کو رنگیں شعاعوں کا ملبوس پہنائیں گے (۵)

ظہیر کاشمیری (۱۲/ اگست 1919ء-۲۱ دسمبر 1994ء) کی طویل نظم 'ایشیا' اُن کے شعری کلیات "عشق و انقلاب" میں شامل ہے۔ اِس نظم کی شہرت کا زمانہ ترقی پسندانہ نظریات کے عروج کا زمانہ ہے، جس کے زیر اثر معاشرے میں بوژوائی انکشاف سے بھرپور اور سامراجی یا طبقاتی تقسیم اور اِس سے جُڑے ہوئے دیگر عوامل کے خلاف شعرا نے بے شمار تخلیقات پیش کیں۔ 'ایشیا' ایک اُبھرتا ہوا 'سماجی و معاشی بلاک' بھی اِسی سوچ کے توسیع پسندانہ عزائم کا حصہ تھا۔ ایشیا اپنی بھوک سے نکلنے کا خواہش مند تھا، اپنے انسانوں کے چہروں کی تازگی تلاش کرنے میں منہمک تھا، اپنے لیے جائے امان ڈھونڈنے نکل پڑا تھا اور مغرب اِس کی جدوجہد سے لاتعلقی کا مسلسل اظہار کر رہا تھا، عالمی تناظر میں مغرب اور مشرق کا یہ تصادم بظاہر دو فکری قوتوں کا تصادم ہے، بباطن ایک اُبھرتی ہوئی معاشی قوت اور دوسری جانب جو قوت کار فرما ہے وہ اپنے عروج کا وقت گزار چکی ہے۔ اب اُسے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے مشرق کا اُبھرنا ایک آنکھ نہیں بھاتا، چنانچہ وہ اِس کے درپے ہے۔
اقبال کے خطیبانہ لہجے نے مشرق کو للکار دی اور پھر 'مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ' اور 'مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی' اور 'عروقِ مردہء مشرق میں زندگی کو دوڑا' ایسے نظریات نے باسیانِ مشرق کے جذبات کو نہ صرف ابھرا بلکہ قوت کے مرتکز ہونے کے عمل میں اِس خطے کی عمل داری کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ یہ نیا اندازِ تخاطب تھا۔ راؤ وکیل احمد ظہیر کاشمیری کے پس منظر کے حوالے سے لکھتے ہیں :

اِس نظم میں جب مزاحمتی فکر سے بنتے ہوئے پیکر کو دیکھتے ہیں تو خاکوں میں سے رنگ اُبھرنے لگتے ہیں۔ "ایشیا" حقیقت میں طلوع ہوتا دِکھائی دیتا ہے۔ نئے معاشرے کی ایک عمل صورت اُبھرنے لگتی ہے، بیرونی قوتیں پسپا ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ (۶)

ایشیا جاگ اُٹھا/ علی سردار جعفری

چل رہے ہیں وقت اور تاریخ کے کھیتوں میں ہل
پھل رہے ہیں پیڑ کی شاخوں میں تلواروں کے پھل
سانس لیتے ہی بج اُٹھتے ہیں ہواؤں میں دہل
الاماں، بگڑی ہوئی سرکش فضاؤں کا تناؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ (۷)

علی سردار جعفری (29 دسمبر 1931ء- یکم اگست2000ء)کی نظم 'ایشیا جاگ اُٹھا'یک کتابی طویل نظم کے طور پر پہلی بار اکتوبر1950ء میں شائع کی گئی جب کہ دوسرا ایڈیشن مارچ1952ء میں مکتبہء شاہراہ، دہلی نے شائع کیا، بعد ازاں اُن کی کلیات میں بھی شامل ہوئی۔ علی سردار جعفری ترقی پسند شعرا میں صف اول کے شاعر تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں نو آبادیاتی نظام کے خلاف جو بھرپور مزاحمتی تحریک شروع ہوئی، یہ نظم اُس کا نکتہء آغاز ہے۔ اِسی پاداش میں علی سردار جعفری نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ کتاب کی پیشانی پر 'سنٹرل جیل' ناسک، بھی درج کیا گیا ہے۔ اُس زمانے میں 'ایشیا جاگ اُٹھا' نے ایسا اثر چھوڑا کہ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے شعرا نے اِس موضوع کو مستقلاً اپنا لیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ 'ایشیا'، 'نیا ایشیا' اور بھی کئی یادگار نظمیں لکھی گئی۔ اِس موضوع کی بُنت میں فکر کا ایسا اشتراک موجود ہے اگر وہ طول پکڑ تا تو آج اِس خطے کے وہ مسائل نہ ہوتے جس میں ہم محبوس ہیں۔

اِس نظم کا موضوعاتی پھیلاؤ جہاں ایک خطے کے لوگوں کا حق تسلیم کرانے پر کمربستہ ہے۔ اسلوب کی گھن گرج، الفاظ کا چناؤ اور اُن کی پیش کش میں للکار کا انداز، متاثر کن ہے، ساتھ ہی یہ نظم فنی اعتبار سے بھی امتزاجی حیثیت لیے ہوئے ہے۔ کلیات میں اِس نظم کے پہلے ۲۲ بند پابند ہیئت میں ہیں۔ پھر ۹ حصے نظم آزاد کی ہیئت میں۔ دسواں اور گیارہویں بند کا کچھ حصہ پابند ہیئت میں اور بارہواں حصہ نظم آزاد اور بارہواں حصے میں نصف آزاد اور باقی نظم پابند ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ جب اِس کی پہلی اور دوسری اشاعت میں متن کا اختلاف موجود ہے اور اِس نظم کو تیرہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے :

یہ ایشیا ہے، جوان، شاداب اور دھنوان ایشیا ہے
کہ جس کے نردھن غریب بچوں کو بھوک کے ناگ ڈس رہے ہیں
وہ ہونٹ جو ماں کے دودھ کے بعد پھر نہ واقف ہوئے کبھی دودھ کے مزے سے
زبانیں ایسی جنھوں نے چکھا نہیں ہے گیہوں کی روٹیوں کو
وہ پیٹھ جس نے سفید کپڑا چھوا نہیں ہے
وہ اُنگلیاں جو کتاب سے مس نہیں ہوئی ہیں

وہ پیر بوٹ اور سلیپر کی شکل پہچانتے نہیں ہیں
وہ سر جو تکیوں کی نرم لذت سے بے خبر ہیں
وہ پیٹ جو بھوک ہی کو بھوجن سمجھ رہے ہیں
یہ نادرِ روزگار انساں(۸)

کرشن چندر، مذکورہ طویل نظم کو ہندوستان کے عمرانی حالات کی بھرپور ترجمانی قرار دیتے ہیں، جہاں ایشیا سمٹ کر ہندوستان کی جغرافیائی سرحدوں میں آ گیا ہے، ایشیا کی ملکیت اور اُس کا تقاضا دراصل اُس نفرت کا اظہار ہے جو ایک عام ہندوستانی کے ذہن میں انگریزوں کے خلاف موجود تھی اور جو فطری تھی اور حالات کی زائیدہ تھی۔ کرشن چندر لکھتے ہیں :

ایشیا جاگ اُٹھا، جو بیک وقت رزمیہ بھی ہے اور غنائیہ بھی۔ جس میں ایک کی مثالیت اور غنائی سندرتا ہے۔ اس نظم میں ایشیا کا سارا سجل روپ سمٹ کر سما گیا ہے۔ اس نظم میں چار ہزار سالہ تہذیب کی تصویر ہے۔ یہاں کی غریبی چیتھڑے پہنے دِکھائی دے رہی ہے، اس کے عوام کی بغاوت کا بے پناہ جذبہ قومی اور ملی احساسات کو سموتا ہوا ایک طوفانی سمندر میں تبدیل ہو گیا ہے۔(۹)

ذلیل جنگوں کے مورچے ڈھا کے ساری انسانیت کی خاطر
وقارِ انساں کے روح و دل کا حسین تر مورچہ بنایا
وہ جس نے قابو میں کر کے رنگِ بہار کا پیرہن پہنایا
اُٹھا لیا مسکرا کے آکاش سے دھنک کا رُباب رنگیں
فلک سے نیچے زمیں پہ جنت کے خواب رنگیں کو کھینچ لایا
جبیں پہ لینن کا سُرخ سورج، لبوں پہ استالنی تبسم
وہ سویت جس کے سر کے اوپر ہے روحِ اِمن واماں کا سایا
(10)

"ایشیا" کی اُبھرتی اور سمٹتی ہوئی طاقت نے نہ صرف اپنی بقا کے لیے ایک اکائی کی صورت ڈھل کر مغرب کو للکارا تو دوسری طرف ایک مشترکہ ورثہ کے میلانات بھی بیسویں صدی کے نصف آخر میں مزاحمتی شاعری کے اہم رُجحانات کی صورت دِکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد شعرا نے 'ایشیا' کو موضوع بنایا اور اپنے اپنے انداز میں اِسے نبھانے کی کوشش کی، مگر علی سردار جعفری کی مذکورہ نظم کی چھاپ یوں بھی گہری ہے کہ اِس کی پرچھائیں دیگر شعرا کے ہاں دِکھائی دیتی ہیں، نہ صرف موضوعاتی سطح پر بلکہ اپنے منفرد اسلوب کی بدولت یہ اثرات دیکھے جا سکتے ہیں :

کہیں ہوا کے تُند راہوار پر سوار ہیں

کہیں گھٹا کی گھن گرج کہیں یہ آبشار ہیں
کہیں خزاں کا روپ ہیں کہیں رُخِ بہار ہیں
ہر ایک رنگ روپ میں فضا پہ چھا رہے ہیں ہم
قدم بڑھا رہے ہیں ہم
(۱۱)

’ایشیا جاگ اُٹھا‘ انگریزوں سے بیزاری کا اعلامیہ ہے اور اِس میں برصغیر کے ایک عام شخص کے جذبات کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے۔ سفید دھوتی، سیاہ کوٹ اور سیاہ ٹوپی ایسی علامات سے مانوس فضا تخلیق کی گئی ہے، جس کے پس منظر میں ’ایشیا سے بھاگ جاؤ‘ ’طوفان آ رہا ہے‘ ’ایشیا جاگ اُٹھا‘ اور ’قدم بڑھا رہے ہیں ہم‘ ایسے نعرے بلند ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن یہ اِس نظم کی ضرورت تھے، مجموعی طور پر نظم شعری پیٹرن سے مملو ہے اور اِسے اپنے عہد کی غیر معمولی تخلیقات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

مشرق / سلیم احمد
مشرق کیا تھا؟
جسم سے اوپر اُٹھنے کی اِک خواہش
شہوت اور جبلت کی تاریکی میں
اِک دیا جلانے کی کوشش تھی!
میں سوچ رہا ہو، سورج مشرق سے نکلا تھا
(مشرق سے جانے کتنے سورج نکلے تھے)
لیکن مغرب ہر سورج کو نگل گیا ہے(12)

سلیم احمد (یکم دسمبر 1927ء-۱۳/ اگست 1983ء) کی یک کتابی طویل نظم ’مشرق‘ ابتدائی صورت میں ۱۹۷۱ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور پھر سلیم احمد کی وفات کے بعد ۱۹۹۱ء میں اپنی موجودہ حیثیت میں منظر عام پر آئی۔ ساڑھے چار ہزار سے زائد مصرعوں پر مشتمل اِس نظم کو بیرونِ ملک میں بھی 1989ء میں کتابی صورت دی گئی۔ نظم میں سوانحی انگ نہ صرف سلیم احمد کی زندگی کے گرد گھومتا ہے بلکہ سیاسی و قومی واقعات کی کسک بھی سنائی دیتی ہے۔ (خاص طور پر ۱۹۷۰ء کے انتخابات، وغیرہ) سلیم احمد نے دیباچے میں نظم کا مکمل خاکہ جس ترتیب سے بیان کیا ہے اُس کے مطابق، یہ طویل نظم تین حصوں پر مشتمل ہونا تھی۔ (۱)۔ مشرق ہار گیا (۲)۔ مغرب ۱۳)۔ رب المشرقین والمغربین اور مکمل نظم کا نام ”کشتی نوح“* رکھنے کی تجویز اُن کے ذہن میں تھی، یوں بھی یہ تلمیح عالمی مذاہب میں بھی سلامتی اور نئی زندگی کا استعارہ ہے۔ اِس تناظر میں قوم جس عظیم سانحے کے بعد شکست خوردگی سے گزر رہی تھی، اُس کے زخموں کو

مندمل کرنے کے لیے سلیم احمد نے مذکورہ نظم میں الفاظ سے جراحت کی تھی۔ اِس طویل نظم کے مندرجات میں دو فصلیں ہیں۔ جن کی تفصیل اِس طرح ہے :

فیصل اول :

۱۔ مشرق ہار گیا ۲۔ میں اور وہ ۳۔ مکاشفہ ۴۔ نام کا سفر ۵۔ آیئے کھیولی چلیں ۶۔ جہاں دل بیچا جہاں جاں خریدی

۷۔ بہار کالونی سے جہانگیر روڈ تک ۸۔ البم نمبر ۱۔ ۹۔ اسٹوڈیو نمبر ۹۔ ۱۰۔ صنم کدہ پروڈکشنز ۱۱۔ البم نمبر ۲

فیصل دوم :

۱۲۔ کافی ہاؤس ۱۳۔ کافی ہاؤس ۱۴۔ نیادور ۱۵۔ درہجو شاعری ۱۶۔ نیند سے پہلے ۱۷۔ ڈِنر ۱۸۔ قصرِ سیاہ ۱۹۔ نیند کی وادی

'مشرق ہار گیا' 1971ء کے قومی سانحے کی بازگشت تو ہے لیکن بہار کالونی سے جہانگیر روڈ تک، البم نمبر ۱، سٹوڈیو نمبر ۹، کافی ہاؤس وغیرہ ایسے اشارے ہیں جن کا براہ راست تعلق سلیم احمد کی روزمرہ زندگی سے ہے۔ نظم جگ بیتی اور آپ بیتی کا حسین امتزاج ہے، جس میں فن کی مہارت کے اعلانمونے ہیں۔ مذکورہ نظمیہ میں مشرق کی شکست یعنی پاکستان کی مشرقی پاکستان میں شکست کو موضوع بنایا گیا ہے ۔یعنی مشرق کا ایک اور بیانیہ۔ جیسا کہ مشفق خواجہ اپنے ایک کالم 'سلیم احمد کے رزمیے کا بزمیہ پہلو' میں زندگی کی بے معنی تیزی اور آشوب میں مبتلا ہوتی زندگی کی بکھرتی روایات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے، لکھتے ہیں:

مشرق ایک طویل نظم ہے، جس میں اُنھوں نے اپنی ذات کے حوالے سے اپنے عہد اور اس کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔(13)

وحدت اور تنوع میں یکجائی کی ایسی صورت دیگر طویل نظموں میں کم کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ نظم میں مختلف ہیتؤں اور مختلف بحروں کا آزادانہ استعمال سلیم احمد کے تخلیقی فشار کے مختلف زاویے ہیں، جن کے پرتو میں روح کا وہ رزمیہ سنائی دیتا ہے، جس کا ذکر سلیم احمد نے اِس شعری مجموعے کے دیباچے میں کیا ہے :

مشرق ہار گیا ہے ؟
یہ بکسر اور پلاسی کی ہار نہیں ہے
ٹیپو اور جھانسی کی رانی کی ہار نہیں ہے
سن ستاون کی جنگ آزادی کی ہار نہیں ہے
ایسی ہار تو جیتی جاسکتی ہے (شاید ہم نے جیت بھی لی ہے)
لیکن مشرق اپنی روح کے اندر ہار گیا ہے (14)

سلیم احمد چونکہ ڈراما نگار بھی تھے ،اِس لیے طویل نظم 'مشرق' میں اُنھوں نے اپنے اِس فن سے بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے، خاص طور پر فلیش بیک تکنیک کے ساتھ ساتھ مکالمہ نگاری، منظر نگاری، کردار، خود کلامی، بیک گراؤنڈ میوزک وغیرہ سے نظم کے سراپے میں بہت سے کام لیے گئے ہیں۔ نظم میں موجود طویل عصری ادبا و شعرا سے اُن کا مکالمہ، نظم کے مضبوط حصوں میں سے ایک ہے، جہاں وہ عبید اللہ علیم، ضمیر علی بدایونی، جمال پانی پتی، عبد المجید سالک، مظہر علی سید، قمر جمیل، رئیس فروغ، اُن کے ہم عصر ہیں اور وہ اُن سے محض شعری روایت کو زیر بحث نہیں لاتے بلکہ اِس مکالمے سے محسوس یہ ہوتا ہے کہ اِس گفتگو کا محور انسان کی بنیادی سرشت ہے۔

علاوہ ازیں نظم کے اسلوب میں بہت سے آہنگ جن میں جوش، رمز، رِقت، طنز، حسرت، رشک اور بلند آہنگی کے بہت سے مقامات آتے ہیں۔ سلیم احمد مشرق کی ہزاروں سال پر پھیلی تہذیب پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں جسے، ڈاکٹر مختار احمد عزمی نے یوں بیان کیا ہے:

اِس نظم 'مشرق' کا کینوس محض پینتیس سال پر ہی پھیلا ہوا نہیں ہے بلکہ مشرق کی ہزاروں سال سے جاری تہذیب کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ اِس نظم میں خاص طور پر ہند اسلامی تہذیب کی روح بولتی ہے۔(15)

"قصرِ سیاہ" کے عنوان سے درج ذیل اشعار میں گہری معنویت کی باز آفرینی پائی جاتی ہے۔ مصرعوں کے بطون میں جو(Gaps وقفے) محسوس ہوتے ہیں، یہ لاشعوری کیفیات پیچیدہ نقوش کو سمٹے ہوئے ہے۔ داخلی اور خارجی ہر دو سطح پر جذبات کی شکست و ریخت جس طرح اُبھرتی اور مٹتی ہے اور ہر آنے والے لمحے میں نئے سانچوں میں ڈھل جاتی ہے، یہ تقلیب متخیلہ اور فہم کے امکانات سے وابستہ ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا:

سوچتا تھا کہ یہ کس راہِ قضا میں، میں ہوں
دیکھتا کیا ہوں کہ اِک دشت بلا میں، میں ہوں
وسعت وقت کی مانند ہے جس کا دامن
ہو کا سناٹا ہے چلتی ہیں ہوائیں سن سن(16)

سراج منیر اِس نظم کو اُردو کی پانچ بہترین نظموں میں شمار کرتے ہیں، اُن کے مطابق:

گر مجھ سے اُردو کی پانچ طویل نظموں کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تو میں تین اقبال کی، ایک حالیاور پانچویں "مشرق" کا انتخاب کروں گا۔(17)

نظم کے آخری حصے 'نیند کی وادی' میں مصرعوں کو ایک ایسے آہنگ میں پیش کیا گیا ہے، جس سے چھٹپٹے کی کیفیت جنم لیتی ہے یعنی سوتے جاگتے کی حالت۔ اُونگنے کے دوران میں جس طرح لفظ ادا ہوتے ہیں، یہ ٹوٹے ہوئے الفاظ یا جملے بے ربط ضرور ہوتے ہیں ،لیکن بے معنی ہرگز نہیں ہوتے، اِن کی اپنی معنویت ہوتی ہے۔ سلیم احمد نے ہنرمندی سے کام لیا ہے کہ الفاظ کی ہیئت کو نہ صرف توڑ کر لکھا گیا بلکہ اُسے ایک مخصوص آہنگ میں بھی لکھا گیا، یعنی لفظوں کو مختلف شکلیں دی گئی ہیں۔ جس سے بھرپور تاثر قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

روشن چہرہ----------کالا چہرہ
کالے چہرے کو دھوؤں
کالے چہرے کو دھوؤں
پانی-----پانی------امی پانی
پرچم-----پرچم-------چم چم
چم چم--------پرچم
میرا پرچم(18)

ڈاکٹر یاسمین سلطانہ، مشرق کے اِس المیے کے نتیجے میں جنم لینے والی تلخی کو ایک اور زاویہ سے دیکھتی ہے، جہاں اُنھیں مشرق کی اقدار پر مغربی یلغار نے اپنے پنجے گاڑ دیئے ہیں، وہ لکھتی ہیں :

سلیم احمد کی طویل نظم "مشرق" اُن کی مشرقی تہذیب سے گہری وابستگی کا اظہار ہے۔ مشرق ایک خطہء زمین کا نام نہیں بلکہ ایک تہذیب، ایک ہیجان جو اَب گرد و غبار اور دُھند و کہر میں چھپ گئی ہے۔ سلیم احمد کو ایسا لگا کہ انسان اپنی پہچان کھو بیٹھا ہے۔ مشرق کے اِس رویے پر وہ دُکھی ہیں کہ مشرق نے اپنی اقدار و حیات سے روگردانی کرکے مغربی طرز احساس کو اپنی تمام روح پر حاوی کر لیا ہے۔ (19)

ڈاکٹر طارق ہاشمی "مشرق" میں "انسان" کے تصور کو مشرق کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ مشرق اور مغرب کے روحانی تصور کو اُنھوں نے حصاریت کی بحث سے منسلک کرکے نئے زاویے سے روشناس کرایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"مغرب کے تصور سے انسان کا روحانی ارتقا رُک گیا ہے، سلیم احمد کے لفظوں میں "رشتہ دید گم ہو گیا ہے" اور اَب انسان اپنے وجود میں مقید اور محصور ہو کر رہ گیا ہے اور اسی "تنگ زنداں کی حد نہ پتا ہے" اُس میں آفاق کی قوت معدوم ہو گئی ہے۔ سلیم احمد کے نزدیک یہ تصور کسی زندہ انسان پر صادق نہیں آسکتا۔ دوسرے لفظوں میں مغرب کے اِن خیالات کے باعث انسان کی موت واقع ہو گئی ہے۔(20)

مشرقی بیانیہ کی جغرافیائی اور نظریاتی حدود کے دروبست کو اپنے مشاہدات و تجربات سے منعکس کرنے کا چلن پاکستان اور ہندوستان کے مشترکہ تخلیقی اور حسی ورثہ کو اہمیت یوں بھی حاصل ہے کہ یہ فطری طور پر جنم لینے والا رویہ تھا، اس کے بطون میں کسی مخصوص ہدف کا حصول نہ تھا- بلکہ مذکورہ نظمیں میں کہیں پر دو جغرافیائی خطوں میں تصادم یا حریف کی صورت پیدا کرنے کی کسی موہوم کی کوشش بھی عنقاد کھائی دیتی ہے-

---

حوالے:

۱۔ احمد ندیم قاسمی: ندیم کی نظمیں، لاہور: سنگ میل پبلشرز (جلد اول) ۱۹۹۱ء، ص500
۲۔ ڈاکٹر سعدیہ طاہر، احمد ندیم قاسمی کے افرویشیائی موضوعات' مشمولہ 'ادبیات' احمد ندیم قاسمی نمبر، جنوری تا جون 2016ء، شمارہ108، ص309
۳۔ احمد ندیم قاسمی: ندیم کی نظمیں، لاہور: سنگ میل پبلشرز (جلد اول) ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۵
۴۔ عمران ازفر: نئی اُردو نظم: نئی تخلیقی جہت، اسلام آباد: پورب اکادمی، 2013ء، ص ۶۸
۵۔ ظہیر کاشمیری: عشق و انقلاب (کلیات) لاہور: الحمد پبلی کیشنز، 1949ء، ص ۱۲۱
۶۔ راؤ وکیل احمد: اُردو میں مزاحمتی شاعری اور ظہیر کاشمیری، مقالہ: ایم فِل، نگران: ڈاکٹر سید عامر سہیل (دورانیہ 2010ء۔2008ء) یونیورسٹی آف سرگودھا، غیر مطبوعہ، ص ۳۰۱
۷۔ علی سردار جعفری: ایشیا جاگ اُٹھا، دہلی: مکتبہ شاہراہ، 1952ء ص ۱۱
۸۔ ایضاً، ص ۴۳

۹۔ کرشن چندر: "پس ورق" مشمولہ ایشیا جاگ اُٹھا دہلی: مکتبہ شاہراہ، 1952ء

10۔ علی سردار جعفری: ایشیا جاگ اُٹھا، دہلی: مکتبہ شاہراہ، 1952ء، ص ۵۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۸۴

12۔ سلیم احمد: کلیاتِ سلیم احمد، اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ ہاؤس، 2003ء، ص370

13۔ مشفق خواجہ: "سلیم احمد کے رزمیے کا بزمیہ پہلو" (کالم) مشمولہ خامہ بگوشیاں، مرتبین: ڈاکٹر انور سدید، خواجہ عبدالرحمن طارق، اسلام آباد: یورب اکادمی، 2010ء، ص ۴۱

14۔ سلیم احمد: کلیاتِ سلیم احمد، اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ ہاؤس، 2003ء، ص ۱۸۳

15۔ ڈاکٹر مختار احمد عزمی: 'رائے' مشمولہ پاکستانی ادب کے معمار، اسلام آباد: ادبیات، 2009ء، ص ۴۳۱

16۔ سلیم احمد: کلیاتِ سلیم احمد، اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ ہاؤس، 2003ء، ص ۸۸۳

17۔ سراج منیر، پس ورق، ایضاً

18۔ سلیم احمد: کلیاتِ سلیم احمد، اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ ہاؤس، 2003ء، ص ۴۷۵

19۔ ڈاکٹر یاسمین سلطانہ: "سلیم احمد کی شاعری میں تلخی دوراں" مشمولہ دریافت (۹) نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، جنوری 2010ء، ص ۱۵۵

20۔ ڈاکٹر طارق ہاشمی: اُردو نظم اور معاصر انسان، اسلام آباد: یورب اکادمی، 2015ء، ص ۲۵۱۔۳۵۱

References:

1. Ahmad nadeem qasmi, nadeem ki nazmee, Lahore: sang mel publichers, 1991, page 500
2. Dr, sadia tahir, ahmad nadeem qasmi ky afro ashiaei mozoat, masmula ‘adbiyat’ ahmad nadeem qasmi number, januray ta june, 2016, shumara, 108, page. 309
3. Ahmad nadeem qasmi, nadeem ki nazmee, Lahore: sang mel publichers, 1991, page 105
4. Imran azfar: nar urdu nazm: nae takhleeqi jaht, Islamabad: yourb ikadmi, 2013, page, 68
5. Zaheem kashmiri: ishaq o inkalab (kulyat) Lahore: al hamd publications, 1949, page121
6. Rao wakeel ahmad: urdu main mazhmti shayri or zaheer kasmeri, mukala: Mphil, nigran: dr, syed amir suhail, university of Sargodha, gair matboa, page 301
7. Ali sardar jafri: ashia jag utha, dehli: makba shahira, 1952, page 11
8. Azeen, page 73
9. Karishan chandr: ‘’pase warq’’, masmula jag utha, dehli: makba shahira, 1952

10.Ali sardar jafri: ashia jag utha, dehli: makba shahira, 1952, page 53
11.Azeen, page 84
12.Saleem ahmad: kulyat saleem ahmad, Islamabad: al hamra publishing house, 2003, page 370
13.Mushfiq khaja: ‘’saleem ahmad ky rizmy ka bazmia pahlo’’, mashmula khama bagoshia, muratben: dr. Anwar sadeed, khaja abdullrahmab tariq, Islamabad: yourb ikadmi, 2010, page,41
14.Saleem ahmad: kulyat saleem ahmad, Islamabad: al hamra publishing house, 2003, page 183
15.Dr, mukhtar ahmad azmi.’ Raye’ mashmula Pakistani abad ky mumar, islsamabad: adbiyat, 2009, page 431
16.Saleem ahmad: kulyat saleem ahmad, Islamabad: al hamra publishing house, 2003, page 883
17.Siraj muneer, pase warq
18.Saleem ahmad: kulyat saleem ahmad, Islamabad: al hamra publishing house, 2003, page 475
19. Dr, yasmeen sultana: ‘’ saleem ahmad ki shatri mein talkhi dora’’ , mashmula daryaft(9) national university of modern languages, Islamabad: January 2010, page 155
20.Dr, tariq hashmi, urdu nazm or muasir insane, Islamabad: yourb ikadmi, 2015, page 251-351